عدل اجتماعی اور اس کی اسلامی بنیادیں

احمد زکی یمانی☆

(۱۷/اپریل ۱۹۶۵ء سے ۲۴/اپریل ۱۹۶۵ء تک، مکہ معظّمہ میں **رابطة العالم الاسلامی** کی مؤتمر منعقد ہوئی۔ اس میں ۵۳ ممالک کے وفود شریک ہوئے۔ الاستاذ احمد زکی یمانی اس وقت سعودی عرب کے وزیر معدنیات و پٹرول تھے۔ اس مؤتمر میں انہوں نے **العدالة الاجتماعیه فی الاسلام** کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ اس مقالے کا اردو ترجمہ ''فکرونظر'' کے شمارہ نمبر ۱، جلد ۳ (جولائی ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے کو دوبارہ شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ مدیر)

ABSTRACT

Wealth in one of the major sources of exploitation.Islam accepts individual's right of property but creates a balance between the interests of individual and community to avoid the exploitation generated by wealth. The author distinguishes between the means to accumulate the wealth and its utilization.

Islam believes that the genuine ownership of wealth belongs to God. Individual makes use of it in His subordination. He/she does not have the absolute right to decide about the utility of his/her wealth. If he deviates or is corrupt, his ownership can be challenged and declined. The basic principle of *Shariah* in this context is that one should save himself and others from the harm. If choice is

DMHL

☆ سابق وزیر پٹرول و معدنیات، مملکت سعودی عرب

between two evils then the lesser should be the adopted. In this paper, the author explores different viewpoints of *fuqha* and jurists and elaborates the concept of collective justice in the light of Islamic injunctions.

آج سے چودہ سو سال پہلے عالم بشریت پر خوف ناک اندھیرا چھایا ہوا تھا، جس میں انسان کا نہ کوئی احترام تھا اور نہ اسے آزادی کی نعمت میسر تھی۔ جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا اور نفسانی خواہشات اور استبداد کا سکہ چلتا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بہتری منظور ہوئی اور اس نے اس خطہ ارض کو جو سب سے زیادہ تاریک تھا، اس غرض کے لیے منتخب فرمایا کہ وہاں ایک ایسی شمع ہدایت روشن کرے، جس سے ساری دنیا نور حاصل کرے اور اس طرح وہ انسان کو اس کی عزت و آزادی واپس لوٹائے اور عدل و انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر ایک اچھا معاشرہ وجود میں لائے۔

غرض ایک معجزہ بروئے کار آیا۔ سر زمین مکہ اور اس کے گرد و پیش کے معاشرہ نے، جہاں نسب پر عزت و شرافت کا مدار تھا اور عیش و عشرت میں غرق آقاؤں کی خدمت میں غلام مشقتیں اٹھاتے تھے، ایک نئے معاشرہ کی شکل اختیار کر لی جس میں انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر تھے اور وہ سب مل کر اس طرح ایک جسم بن گئے کہ اگر اس کے ایک حصے کو کوئی شکایت ہوتی تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا۔

ہماری آج کی دنیا ایک مہلک حیرت و اضطراب اور گھپ اندھیرے میں زندگی گزار رہی ہے، صنعت و حرفت کی تمام روشنیاں ان اندھیروں کو دور کرنے سے عاجز اور اہل دنیا کو اطمینان قلب اور حقیقی آزادی واپس دلانے سے قاصر ہیں۔ کینہ ور شیوعیت (کمیونزم) کی افراط اور مستبد سرمایہ داری کی تفریط کے درمیان انسان اپنا احترام کھو چکا ہے اور اقوام عالم اصلاح احوال کے لیے جو بھی تجربے کرتی ہیں، ان سے حالات اور بھی خراب اور بدتر ہو جاتے ہیں۔ آج عقلا اور دانش مند اسی نازک صورت حال پر غور کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے سامنے معاشرے کے ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے اور متضاد گروہوں کی باہمی طبقاتی کشمکش کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اجتماعی ظلم کا ہمہ گیر مسئلہ

حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادات کے لیے فرض کیا ہے اور اس

لیے بھی کہ اس ضمن میں لوگ اپنے منافع دیکھیں اور باہم مل کر اپنی مشکلات کے بارے میں صلاح ومشورہ کریں ہم سب کے سب اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں کہ اس اجتماعی ظلم کے مسئلے پر غور کریں جس کی جڑوں نے ہر جگہ پھیل کر سرطان کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس کی جو بھی دوا کی جاتی ہے اس سے مرض اور بڑھتا ہے۔

ہم یہاں مکہ میں جو منبع ہدایات اور مصدر نور ہے۔ اس لیے یہاں ہم سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ ہم دوسروں کی طرح ان تجروں کی طرف رجوع کریں، جو ناکام ثابت ہو چکے ہیں یا کم ازکم ان کی کامیابی پایہ ثبوت کونہیں پہنچی۔ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ انہی چیزوں کو باہر سے درآمد کریں اور ان کے اجنبی ہونے اور ان کے نقصانات کے باوجود یہاں انہیں نافذ کرنے لگ جائیں۔ درآں حالیکہ ہمارے پاس ایک کامیاب تجربہ موجود ہے، جس کا ہم سے قریب ترین تعلق ہے۔ یعنی ہم اس کے ہیں اور وہ ہمارا ہے ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ (یہ کتاب ہے جس کی محکم آیات ہیں۔ اور زبردست اور حکمت والے کی جانب سے نازل ہوئی ہے) اور وہ شریعت ہے، جس نے ایسا نظام عدل و انصاف قائم کیا جو فرد کے احترام و آزادی کا محافظ ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے جماعت کی خدمت کا پابند بناتا ہے۔ اس نظام میں نہ فرد جماعت پر مسلط ہوتا ہے اور نہ جماعت میں اس کی ذات فنا ہوتی ہے البتہ جب جماعت کی مصلحتوں سے اس کی ٹکر ہو تو اس وقت بے شک فرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک آج ہمارے لیے اس مسئلہ سے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، بڑھ کر کوئی مسئلہ نہیں اور اس سے زیادہ ہمیں کسی اور کے حل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ حل ہمارے دین اور ہماری تاریخ سے اخذ ہونا چاہیے۔ ہم نے اگر یہ نہ کیا تو جو امانت ہمیں دی گئی ہے وہ گویا ہم نے ضائع کر دی اور مسلمان اقوام کو طوفان کے حوالے کر دیا کہ وہ انہیں بہا کر لے جائے اور مچھلیاں ان کو نگل جائیں۔۔

اس سلسلے میں صرف یہ کافی نہیں کہ ہم لوگوں کو یہ کہیں کہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اسلام کو عملی جامہ پہنایا جائے اور اس کے اوامر و احکام کی متابعت ہو اور اس کے بعد ہم اپنے ملکوں کو چلے جائیں اور مصیبت زدوں کی چیخیں اور مظلوموں اور بھوکوں کی آہیں ہمارے کانوں میں آتی رہیں اور ہمارے پاس کوئی معین منصوبہ نہ ہو کہ ہم اسے مسلمان اقوام کی مشکلات کے حل کے طور پر پیش کرسکیں۔ ان حالات میں ہم پر یہ فرض ہے کہ اسلام سے ایسے احکام کا استنباط کریں، جن سے موجودہ مشکلات کا علاج ہو سکے۔ اس کے بعد احکام کی تطبیق دینے کے لیے استعداد پیدا کریں اور اس راہ میں نہ ہمیں جانوں کی پروا ہو اور نہ مال کی۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ عدل اجتماعی کو بروئے کار لانے اور لوگوں کو جور وظلم سے بچانے کے سلسلے میں اسلام نے جو ہدایات دی ہیں اور اس بارے میں اسلام نے جو حل پیش کیا ہے اور انہیں کس طرح عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے، میں ان پر پوری طرح بحث کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔ یہ میری حد مقدرت سے باہر ہے میں تو بس اس بحث کا دروازہ کھول رہا ہوں تا کہ جن حضرات کا مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم اور لوگوں کی مشکلات کا تجربہ ہے ان امور پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکیں۔

زیر بحث موضوع:

اجتماعی ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک ظلم تو وہ ہے، جس کا نشانہ فرد بنتا ہے یہ ظلم فرد کی شخصیت کو ختم اور اس کی آزاد و احترام کی نفی کر دیتا ہے اور یہ سب جماعت کے نام سے اور مصلحت عامہ کے تحت ہوتا ہے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد کی طاقت شل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں اور وہ جماعت کے لیے کسی کام کا نہیں رہتا۔ یہ چیز آج آپ کو انتہا پسند اشتراکی نظاموں میں ملتی ہے۔

اسی طرح غیر اشتراکی نظام میں بھی ایک فرد کو اپنے رنگ، مذہب اور اپنی قومیت کی بنا پر احترام و آزاد سے محروم رکھا جاتا ہے اور وہاں خود جماعت بھی افراد کی حرص وطمع کی وجہ سے اجتماعی ظلم کا شکار ہوتی ہے۔ اس نظام میں اجارہ داری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔ لوگوں سے ان کی روزی چھین لی جاتی ہے اور یوں چند افراد کے ہاتھ میں بے شمار دولت جمع ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثریت مصیبتیں اٹھاتی ہے اور اقلیت عیش کرتی ہے۔ معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور آئے دن کی شورشوں اور انقلابوں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہ استحصال پسند نظام حد سے بڑھی ہوئی سرمایہ داری کا ہے اور اس میں فرد اور جماعت ہر دو اجتماعی ظلم کا نشانہ بنتے ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سارے اجتماعی ظلم کا مبدا و مصدر دولت ہے اور یہ مان کر اجتماعی ظلم کا جو بھی علاج کیا جاتا ہے، وہ ایک تو سراسر مادی ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں بڑی تنگ نظری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ظلم کا توڑ ظلم سے کیا جاتا ہے اور حرص وطمع کا علاج کینہ و منافرت میں ڈھونڈا جاتا ہے۔

اس بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے بھی بے شک مال و دولت کو خاص اہمیت دی ہے اور اس پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی ہے کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ دولت ہی اجتماعی ظلم کا ایک بہت بڑا سبب ہے

لیکن اسلام نے اس مسئلہ دولت سے مختلف طریقوں سے نمٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے پیش نظر سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے یہ جو دو پلڑے ہوتے ہیں، ان کو برابر رکھا جائے اور اگر دو میں سے کسی ایک کا جھکنا ناگزیر ہو، تو وہ پلڑا جماعت کا ہو۔ اسلام کے نزدیک اجتماعی عدل و انصاف کے معنی صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو مساوی اجرتیں ملیں اور اس طرح اقتصادی ناہمواری نہ پیدا ہو سکے، جیسا کہ اشتراکی نظام میں ہے، لیکن یہ چیز عملی زندگی میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام ایک ایسی انسانی مساوات چاہتا ہے، جو بہت سی قدروں کی جامع ہو اور ظاہر ہے ان قدروں میں سے یقیناً ایک قدر اقتصادی بھی ہوگی۔ جس کے مطابق سب کو ایک سے مواقع حاصل ہوں اور سب افراد اپنی عملی صلاحیتوں کے اظہار میں آزاد ہوں۔

حق ملکیت اور افراد کے حقوق:

دولت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر بڑا عادلانہ اور دانش مندانہ ہے۔ سب سے پہلے تو وہ انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اس ملکیت کو اتنا ہی قابل احترام سمجھتا ہے، جتنا انسانی جان کو[۱] وہ مال کے مالک کو مال کی حفاظت کا حق دیتا ہے اور وہ اس کے لیے لڑ بھی سکتا ہے۔ اگر مال کا مالک اس کی حفاظت کرتا ہوا جان دے دے، تو شہید ہوگا[۲] اگر اس کے مال پر چور دست درازی کرے، تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔[۳] یا اگر کوئی شخص اس کے مال کو غصب کرے، تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہوگا۔[۴]

ایک فرد اگر شرعی لحاظ سے جائز طریقوں سے مال حاصل کرتا ہے۔ تو وہ اسے بلا کسی مانع کے استعمال

۱- یٰۤاَیھا الناس ان دماء کم و أموالکم علیکم حرام إلی ان تلقوا ربکم کحرمة یومکم هذا و کحرمة شهر کم هذا (اے لوگو بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال تم پر قابل حرمت ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملو ایسے ہی قابل حرمت ہیں جیسے یہ دن اور جیسے یہ مہینہ) (خطبہ الوداع)

۲- من قتل دون ماله فهو شهید (جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے)، اخرجه الشیخان

۳- ﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ (چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو یہ سزا ہے اللہ کی طرف سے ان کے اس فعل کی جو انہوں نے کیا)، (القرآن: المائدہ)

۴- من اقتطع مال امری، مسلم بغیر حق لقی اللّٰه عزوجل وهو علیه غضبان (جس نے کسی مسلمان کا بغیر حق کے مال لے لیا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا)، (مسند امام احمد)

کرنے کا حق رکھتا ہے۔[5] اور یہ اس لیے کہ اللہ نے جو نعمت دی ہے، اس کے آثار اس سے ظاہر ہوں[6] اس بارے میں کنجوسی بھی اتنی ہی ممنوع ہے، جس قدر فضول خرچی[7] وہ اس مال کو شرعاً جائز طریقوں سے افزائش مال کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے جماعت کے مفادات و مصالح پر زد نہ پڑے۔ جس صاحب مال کا انتقال ہو جائے تو اس کی متروکہ ثروت اس کے وارثوں پر فطری طریقے پر تقسیم ہوگی اور وہ ایک جگہ جمع نہیں رہے گی۔[8]

اسلام کے نزدیک ملکیت نام ہے نیابت اور اجتماعی فریضہ کا چنانچہ باوجود اس کے اسلام نے انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور اسے ہر طرح کی ضمانت دی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے مال کے مالک کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس دینی اساس کو اچھی طرح سے سمجھ لے، جس پر کہ اس کی ملکیت قائم ہے اور اس اہم مقصد کو جانے، جس کی بنا پر اسے ملکیت میں تصرف کرنے کا حق دیا گیا ہے اور یہ اس لیے کہ صاحب مال کے اندر ایسی نفسیاتی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ طمع و حرص سے بچ کر اس اجتماعی فریضہ کو ادا کر سکے، جو بحیثیت مال کے مالک کے اس پر عائد ہوتا۔

قرآن مجید نے کئی جگہ وضاحت کی ہے کہ مال کا اصلاً مالک اس کا دنیاوی مالک نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت تو محض ایک نائب اور وکیل کی ہے اور اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْض﴾[9] (جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ سب اللہ کے لیے ہے۔ اللہ نے

۵- ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (اے نبی کہہ دو کس نے اللہ کی قابل زینت چیزوں کو جو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیں اور روزی کی اچھی چیزوں کو حرام ٹھہرایا)، ﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (اے بنی آدم ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو)، (القرآن: الاعراف)

۶- اذا آتاک اللّٰہ مالا فلیرا اثر نعمۃ اللّٰہ علیک و کرامتہ (جب اللہ تعالیٰ تمہیں مال دے تو اللہ کی نعمت اور تکریم کا تم پر اثر دیکھا جانا چاہیے)، (ابو داؤد و نسائی)

۷- ﴿وَ لَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَ لَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ (اور نہ اپنا ہاتھ گردن سے ہی باندھ لینا چاہئے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہئے ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے) (سورہ الاسراء)

۸- ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ﴾ (ماں باپ اور قربت دار جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں کے لیے حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور قربت دار چھوڑ جائیں)، (سورہ النساء)

۹- ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ (اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں)

اپنے بندوں کو اس ملکیت کے استعمال کے لیے نائب بنایا ہے۔) ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ﴾(۱۰) (ایمان لاوَ اللہ اور اس کے رسول پر اور جس مال میں اس نے تم کو نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو) قرآن مجید میں جہاں غلاموں کی مکاتبت کا ذکر ہے، وہاں فرمایا گیا ہے: ﴿وَّاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ﴾(۱۱) (اللہ کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے، انہیں دو) چنانچہ یہاں جن لوگوں کو مال دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ دراصل ایک واسطہ ہیں۔ مال تو اللہ کا ہے اور انہیں اللہ نے اس مال پر اپنا نائب و وکیل بنایا ہے۔

یہ ہے اسلام کے نزدیک ملکیت کی دینی اساس اور یہی اسلام کا اہم اصول ہے۔ غرضیکہ مال کا اصل مالک تو اللہ ہے اور اس دنیا میں اس کا جو مالک ہوتا ہے، وہ اس مال سے استفادہ کرنے والا مالک ہوتا ہے، وہ اس مال کا حقیقی اور اصلاً مالک نہیں ہوتا۔ اب اگر استفادہ کرنے والا مالک جن شرائط پر اسے استفادہ کا حق دیا گیا ہے۔ ان کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو اسے اس وقت تک اس حق سے محروم کر دیا جائے گا، جب تک وہ اس کا اہل ثابت نہ ہو جائے ﴿وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْھُمْ فِیْھَا وَ اکْسُوْھُمْ﴾(۱۲) (تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو، جن کو خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے مایہ زندگی بنایا ہے اور ان مالوں سے ان کو کھلاتے رہو اور پہناتے رہو) اگر مال سے استفادہ کرنے والا مال میں اس طرح تصرف کرتا ہے، جس سے جماعت کے مفادات و مصالح کو نقصان پہنچتا ہے اور اس ضمن میں درحقیقت جماعت کے مفادات و مصالح ہی اصل مقصد ہیں، تو اس صورت میں اسے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا اور اس سے جماعت کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ اب اگر یہ شخص مر جاتا ہے اور کوئی وارث نہیں چھوڑتا۔ تو یہ مال جماعت کی طرف لوٹے گا۔ کیونکہ مال پر اصل حق تو جماعت کا ہے۔ یہ شخص جماعت کے مفادات و مصالح کے تحت اس مال میں تصرف کرتا ہے اور اسے افزائش مال کے لیے استعمال کرتا ہے۔

شریعت اسلامی پہلا نظام قانون ہے جس نے انفرادی حقوق کے استعمال پر اس غرض سے پابندیاں عائد کی ہیں کہ اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اور اس طرح صاحب مال کے اختیار کو محدود کر دیا ہے۔

۱۰- سورہ الحدید:۷

۱۱- سورہ النور:۳۳

۱۲- سورہ النساء:۵

قرآن مجید نے بہت سے مقامات میں اس سلسلے میں زیادتیوں کے ارتکاب سے روکا ہے۔ خاص طور سے وصیت، طلاق اور دوسروں سے اپنا حق طلب کرنے جیسے معاملات میں زیادتی کرنے کی ممانعت آئی ہے۔[۱۳] اس بارے میں شریعت اسلامی کا بنیادی اصول یہ ہے: نہ تو خود نقصان اٹھایا جائے اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے اور یہ کہ اگر دو برائیاں ناگزیر ہوں، تو سب سے کم برائی اختیار کی جائے۔

حنفی اور مالکی مسلک:

جماعت کے مفادات و مصالح فرد کے مفادات و مصالح سے مقدم ہیں، حنفی اور مالکی فقہی مسالک میں ہمیں بڑے واضح احکام ملتے ہیں۔

کسی حق کو صرف اسی غرض کے لیے استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس غرض کے لیے وہ حق دیا جائے۔ امام مالک نے اسی اصول کو احوال شخصی کے مسائل پر منطبق کیا ہے۔ خاص طور پر جیسا کہ باپ کا اپنے صغیر سن بیٹے کے اموال کا متولی ہونا۔[۱۴] باپ کا اپنی صغیر سن لڑکی کا اس کے ارادے کے بغیر نکاح کرنا۔[۱۵] ایک بالغ لڑکی کے ولی باپ کا اس کے نکاح پر معترض ہونا۔[۱۶]

امام ابو حنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) نے اسی اصول کو صغیر سن لڑکے کے باپ اور ولی کے اس لڑکے کے اموال پر متولی ہونے اور نکاح کے معاملے میں وکیل کو وکالت عامہ دینے کے معاملات پر منطبق کیا ہے۔ اور یہ حقوق باپ و ولی اور وکیل کو اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے مفادات کا خیال رکھیں، جو ان کی نگرانی میں ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ نکاح کے معاملے میں وکالت عامہ دیے جانے کے بارے میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین میں اختلاف ہے۔[۱۷]

۱۳- وصیت کے بارے میں آیت ہے: ﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾ (البقرہ) طلاق کے حق کے میں آیت ہے: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾، اپنا حق طلب کرنے کے بارے میں آیت ہے: ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

۱۴- الامام مالک، المدونۃ الکبری (امام عبد الرحمٰن بن القاسم سے امام سحنون کی روایت، جز ۱۴، ص ۱۹۹

۱۵- المدونۃ الکبری، ج ۴، ص ۵

۱۶- ایضاً، ص ۱۴

۱۷- امام ابو یوسف، کتاب الخراج، و بھامشہ الجامع الصغیر لمحمد، حاشیہ، ص ۳۳

اگر کسی حق کو استعمال کرنے سے خلاف معمول ضرر پہنچے تو یہ حق شرعاً ناجائز ہو گا۔ امام مالک نے اس اصول کو عمومی لحاظ سے پڑوس کے تعلقات [۱۸]، مکانوں کی کھڑکیاں کھولنے کی وجہ سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کو نمٹانے [۱۹] شاملات کی چیزوں کو تقسیم کرنے [۲۰] غیر آباد زمینوں پر قبضہ کرنے [۲۱] پر منطبق کیا ہے اور اس بارے میں یہ فیصلہ دیا، کہ اگر مذکورہ بالا معاملات میں کسی حق کے استعمال سے خلاف معمول ضرور پہنچے تو صاحب حق کو اپنے حق کے استعمال سے روکا جا سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ اور صاحبین نے اس اصول کو کئی منزلہ مکانات کے مالکوں کے حقوق و واجبات، موکل کی غیر موجودگی میں وکیل کے موکل کی وکالت سے دست بردار ہونے اور کام والے کے حق کو کسی شخص سے اس نے کام کے متعلق جو معاہدہ کیا ہے، اس کو فسخ کرنے کے بارے میں مقید کیے جانے پر منطبق کیا ہے۔[۲۲]

اب ایک شخص ہے جسے اپنے حق کے استعمال سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، لیکن اس سے دوسروں کو نقصان ہوتا ہے، تو اس حق کو استعمال ناجائز ہوگا۔ اس اصول کا مقصد پڑوسی کو اس کے کسی ایسے حق ملکیت کے استعمال سے روکنا ہے، جس سے اسے تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ امام مالک نے اس بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ دوسروں کو ضرر پہنچانے کے لیے اپنے حق ملکیت کا سہارا لینا جائز نہیں۔[۲۳]

اسی غرض کے لیے حنفیہ نے بھی اس اصول کو استعمال کیا اور کتاب الخراج اس اصول کی عملی تطبیقات سے بھری پڑی ہے۔ جن میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ امام ابو یوسف غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے معاملے میں امرا اور والیان حکومت ہر دو کے حق کو اس بنا پر محدود کرتے ہیں اگر اس سے دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے۔[۲۴]

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حقوق اور ان کے استعمال کے متعلق حنفیہ اور

۱۸- المدونة الکبری، ج ۱۴، ص ۲۳۵

۱۹- ایضاً، ج ۱۵، ص ۱۹۷

۲۰- ایضاً، ج ۱۴، ص ۲۲۱

۲۱- ایضاً، ج ۱۵، ص ۱۹۵

۲۲- کتاب الخراج، حاشیہ ۱۰۲-۱۰۳

۲۳- المدونة الکبری، ج ۱۵، ص ۱۹۴-۱۹۵

۲۴- کتاب الخراج، ص ۵۳

مالکیہ کا نقطہ نظر آپس میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر حق سے ایک غرض اور مقصد وابستہ ہوتا ہے۔ جسے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر صاحب حق اس مقصد کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور وہ اپنے اس حق کو دوسروں کی ضرر رسانی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا ایسا کرنا ظلم اور زیادتی سمجھا جائے گا اور اس حق کا کوئی قانونی جواز نہیں رہے گا۔

امام شافعی کا مسلک:

امام شافعی عام طور پر اس نظریے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک حقوق علی الاطلاق صاحب حقوق کے ہیں اور وہ جیسے چاہے، اسے استعمال کرسکتا ہے، خواہ اس میں اسے کوئی فائدہ نہ ہو، یا دوسروں کو اس سے نقصان پہنچے لیکن اس کے باوجود بعض قرآنی احکام اور مستقل عادات کی وجہ سے وہ مجبور ہوئے کہ اپنے اس اصول کو مطلق نہ رہنے دیں،[۲۵] امام شافعی کے بعد ان کے جو شاگرد آئے، انہوں نے امام صاحب کی اس رائے سے اختلاف کیا اور وہ اس بارے میں حنیفہ اور مالکیہ کے مسلک پر چلے۔ امام شافعی کی اس رائے کے خلاف شوافع میں سے جس قابل ذکر شخص نے لکھا ہے، وہ امام غزالی ہیں۔ انہوں نے نکاح، طلاق، معاہدہ اور پڑوسی کے حقوق پر اسی اجتماعی مقصد کی روشنی میں بحث کی ہے۔ [۲۶]

متأخرین میں اس نظریے کے قواعد و ضوابط کے اثبات میں ابن القیم کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انہوں نے امام شافعی کی رائے کی مخالفت کی کیونکہ یہ رائے ظلم کی موجب اور عدل و انصاف کے منافی ہے۔[۲۷] چنانچہ نویں صدی ہجری کے فقہاء کے ہاں تقریباً یہ رائے عام طور پر تسلیم کی جانے لگی کہ حق کے استعمال میں دوسروں پر ظلم و زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔[۲۸] مجلّہ الاحکام العدلیہ کی اکثر دفعات میں اس نظریے کی تطبیقات ملتی ہیں (دفعات ۱۱۹۸-۱۲۱۲) اسی طرح قدری پاشا مرحوم نے اپنی کتاب الاحوال العینیہ میں اس نظریے کی بعض تطبیقات بیان کی ہیں۔ (دفعات ۵۷-۵۹) ۱۹۴۸ء میں اپنے حق کے استعمال میں ظلم و زیادتی کے ارتکاب کے اس نظریے کو جیسا کہ وہ شریعت میں ہے، مصر میں داخل کیا گیا ہے۔

۲۵- امام شافعی، کتاب الام، ج ۵، ص ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۲۱

۲۶- امام غزالی، احیاء علوم الدین، ج ۲، ص ۱۴، ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۴۸، ۲۱۳

۲۷- امام ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۳، ص ۱۴۳، ۱۴۴

۲۸- ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار

اسلام کا نظریہ ملکیت اور یورپی ماہرین قانون

یورپ کے ماہرین قانون میں سے جو اسلام کے اس نظریہ ملکیت،اس کے مقاصد اور اس کے انفرادی حقوق کے استعمال پر جو قیود عائد ہیں، ان سے متاثر ہوئے، ان میں سے ایک فرانسیسی پروفیسر دوجی تھے۔ موصوف ایک عرصے تک قاہرہ میں لا کالج کے پرنسپل رہے تھے اور ظاہر ہے اس دوران ان کا مصر کے علما و فقہا سے ملنا جلنا رہا۔ پروفیسر دو جی نے اپنا ''تکافل اجتماعی'' (اجتماعی کفالت) کا مشہور نظریہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ملکیت کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ بعد ازاں انہوں نے اس کی بالکل اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تشریح کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ مغرب میں خوب مقبول ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب اکتوبر ہوا، تو ملکیت کے بارے میں بالشویکوں کے اپنے جو نظریے تھے، وہ حقیقت واقعی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور وہ انہیں روس کے اس وقت کے حالات میں منطبق کرنے میں ناکام رہے۔ انقلاب کے پانچ سال بعد لینن مجبور ہو گیا کہ وہ بعض بورژوائی قوانین ملکیت کو بحال کرے تاکہ ان کو شیوعیت کی منزل تک پہنچنے سے پہلے کا جو دور انتقال ہے، اس میں نافذ کیا جائے۔ اسے N.E.P (نیو اکنامک پالیسی) کا نام دیا گیا۔ لینن نے اپنی اس پالیسی کی تشکیل میں پروفیسر دوجی کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس کا خود بہت سے روسی ماہرین قانون نے اعتراف کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے اس لکھے ہوئے سے پھر گئے ہیں۔[۲۹] لینن کے اس قانون کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ یہ قانون شہری حقوق کی حفاظت کرتا ہے، سوائے ان حالات کے جب کہ انہیں اجتماعی و اقتصادی اغراض کے خلاف استعمال کیا جائے۔

اس سبب سے قطع نظر، جس کی بنا پر اسلامی شریعت اور سوویت روس کے قانون کی اس دفعہ میں مشابہت پائی جاتی ہے، اس سے جو نتائج نکلے، وہ ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے۔ اور وہ اس لیے کہ مسلمانوں کے ہاں اصل چیز یہ ہے کہ ملکیت کی کامل حفاظت کی جائے لیکن اس کے برخلاف اس معاملے میں بالشویک دوسری انتہا سے اپنی بات شروع کرتے ہیں۔ وہ سرے سے ملکیت کا ہی انکار کرتے ہیں اور اسے اصلاً باطل قرار دیتے ہیں لیکن بعد میں جب انہیں حقائق واقعی مجبور کرتے ہیں، تو وہ ملکیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کا استعمال اجتماعی و اقتصادی اغراض کے لیے ہو۔

۲۹- کتاب القانون

انفرادی ملکیت کے بارے میں اسلام کا عمومی نقطہ نظر

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اسلام نے کس طرح انفرادی ملکیت کی اجازت دی ہے اور اس حق کی ہر ممکن وسائل سے حفاظت کی ہے۔ اس کے بعد اس حق کے تصرفات کو اجتماعی قیود کا پابند کر دیا ہے تاکہ ان سے جماعت کو نقصان نہ پہنچے اور انفرادی ملکیت جماعت کی سعادت کا سبب بنے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے انفرادی حرص وطمع کے امکانات کو قابو میں رکھنے کے لیے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے چند ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع ہونے کا بھی سد باب کیا ہے۔ قرآن نے اغنیا کے بجائے خاص طور پر صرف فقرا کو مال فئی (وہ مال غنیمت جو بغیر لڑائی کے ہاتھ آئے، دیے جانے کا جو سبب بتایا ہے، وہ یہ ہے ﴿لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (تم میں سے جو اغنیا ہیں، صرف انہیں کے درمیان مال منتقل نہ ہوتا رہے)۔ اس کے علاوہ اسلام نے نفع پر نہیں بلکہ اصل سرمائے پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ اس ضمن میں اسلام کا وراثت کا قانون آتا ہے جس کے تحت متوفی کی ثروت سب رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ مزید برآں اسلام نے ناجائز ذرائع سے افزائش دولت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ غرض یہ سب امور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک مال سے اصل غرض فرد اور جماعت کی خدمت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مال چند ہاتھوں میں جمع ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے حد سے بڑھی ہوئی آرام کی زندگی اور تعیش (ترف) سے بھی منع کیا ہے۔ قرآن ایسی زندگی گزارنے والوں کو ہلاکت کی دھمکی دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ترف ایک اضافی چیز ہے لیکن اس کے باوجود یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام معاشرے کے افراد کے درمیان حد سے بڑھے ہوئے معاشی تفاوت کا مخالف ہے اور اس کے خلاف وہ اعلان جنگ کرتا ہے۔

وسائل ملکیت اور افزائش دولت کے طریقے

جن وسائل سے ایک فرد صاحب ملکیت بنتا ہے۔ اسلام نے ان کا تعین کر دیا ہے۔ اسی طرح اس کا حکم ہے کہ ان وسائل کے بغیر کوئی ملکیت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔ فقہائے مسلمین کے نزدیک ملکیت کا حق خود اشیاء کی طبیعت سے صادر نہیں ہوتا بلکہ اس حق کا اثبات شارع کرتا ہے۔ یعنی شرعاً سبب منتج ہوتا ہے، اس کے مسبب کا۔ (۳۰)

۳۰- شیخ ابو زہرۃ، الملکیۃ و نظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیۃ

وسائل ملکیت میں سب سے اہم وسیلہ غیر آباد زمینوں کو آباد کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''عام زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ اس کے بعد تمہاری ہے، جو غیر آباد زمین آباد کرے اور اگر ایک شخص تین سال تک زمین روکے رکھے اور اسے آباد نہ کرے، تو اس زمین پر اس کا حق نہیں رہتا۔[۳۱] بہت سے فقہاء کے نزدیک غیر آباد زمین کو آباد کرنے کی اجازت صرف امام ہی دے سکتا ہے، اور ایک فرد کو وہی کرنا چاہیے، جو اس کا امام پسند کرے (مقالہ نگار کے نزدیک امام سے مراد بالعموم جماعت ہے)۔

وسائل ملکیت میں سے اہم وسیلہ عمل ہے۔ جس کے کرنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا اور اس کی ہمیں ترغیب دلائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾[۳۲]

ان سے کہو کہ عمل کریں اور جو تم عمل کرو گے، اسے اللہ اس کا رسول اور مومنین عنقریب دیکھیں گے۔

اس کے بعد ایک اور آیت ہے:

﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ﴾[۳۳]

تم اس (زمین) کے رستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ۔

رسول اکرم ﷺ نے عامل (کام کرنے والے) کی بڑی تکریم فرمائی اور عمل کرنے پرزور دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

''ان اللّٰہ یحب العبد المؤمن المحترف،،[۳۴]

اللہ تعالیٰ روزگار کرنے والے مومن کو محبوب رکھتا ہے۔

آپ کا اور ایک ارشاد ہے:

''ما أکل أحد کم طعاما قط خیرا من عمل یدہ،،[۳۵]

۳۱- امام ابو یوسف، کتاب الخراج

۳۲- سورہ التوبہ:۱۰۵

۳۳- سورہ الملک۱۵

۳۴- القرطبی فی تفسیرہ، ج ۴، ص ۱۸۹ (تفسیر سورۃ ال عمران: ۱۲۲)

۳۵- البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عملہ بیدہ، حدیث نمبر۲۰۷۲، ج ۳، ص ۵۷

تم میں سے کسی نے کبھی اس کھانے سے بہتر کھانا نہیں کھایا ہوگا، جو تمہیں
اپنے ہاتھ کے عمل سے حاصل ہوا ہو۔

آنحضرت ﷺ خود بکریاں چرایا کرتے تھے اور آپ کو حضرت خدیجہ نے اپنے تجارتی کاروبار کے لیے رکھا تھا۔ آپ کے بعد آپ کے خلفا اور صحابہ بھی مختلف کام کرتے تھے۔

اسلام نے ملکیت کے جو وسائل و ذرائع بتائے ہیں۔ اگر ان کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وراثت اور اقطاع (حکومت کا عطا کردہ مال) کو مستثنیٰ کر کے ان سب کا مرکز و مرجع صرف عمل ہے اور یہ جو دو وسیلے مستثنیٰ ہیں۔ ان کا پورا جواز موجود ہے۔ بات یہ ہے کہ اکیلا مال افزائش مال کا سبب نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے ساتھ عمل و محنت نہ شامل ہو۔ اب ایک طرف اسلام اور دوسری طرف اشتراکیت و سرمایہ داری کے نظاموں میں جو فرق ہے، وہ یہاں اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ جہاں تک سرمایہ داری کا تعلق ہے بے شک اس میں عمل کی آزادی ہے بلکہ اس کے ہاں یہ وسائل ملکیت میں سے ہے لیکن اس نے افزائش مال کے معاملے میں صرف سرمائے کو حق مطلق دیا ہے اور اس کے ہاں یہ اصول مقرر ہے کہ پیسہ پیسے کو کماتا ہے۔ جہاں تک شیوعیت کا تعلق ہے، وہ نہ تو ملکیت میں اور نہ افزائش مال میں سرمائے کا کسی طرح کا عمل دخل مانتی ہے، نہ اکیلے سرمائے کا اور نہ سرمایہ اور عمل دونوں کے اشتراک کا شیوعیت صرف عمل و محنت کو یہ امتیاز دیتی ہے اس کے برعکس اسلام کا موقف ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ عمل و محنت کی اسی طرح تکریم کرتا ہے۔ جیسے اشتراکیت کے اصول و مبادی اس کی تکریم کرتے ہیں۔ بلکہ اس عمل و محنت کی اس سے بھی بڑھ کر تکریم کرتا ہے اور وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ کے لیے سرمائے سے دولت میں افزائش و اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ربا کو جو بغیر عمل کے افزائش عمل کا ذریعہ ہے، بڑی سختی سے حرام قرار دیتا ہے لیکن وہ شیوعیت کی اس بارے میں ضرور مخالفت کرتا ہے کہ اسلام کے نزدیک افزائش دولت اور اثبات ملکیت کے لیے عمل و محنت کے ساتھ سرمائے کی شرکت ضروری اور لا بدی ہے چنانچہ اس کے لیے اسلام نے وہ قواعد بھی وضع کیے ہیں، جو شیوعیت اور سرمایہ کی افراط و تفریط کو روک سکتے ہیں۔

اگرچہ اسلام افزائش دولت کے عمل عمل و محنت اور سرمائے دونوں کی شراکت کا حامی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس سلسلے کی بعض شراکتوں کو بدرجہ اقل مکروہ تنزیہی سمجھتا ہے جیسے کہ مثال کے طور پر زمین کی مزارعت (بٹائی) ہے۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے:

خرج النبی إلی أرض وهی تهز زرعا فقال لمن هذا. فقالوا

إكتراها فلان. فقال لو منحها كان خيرا من أن يأخذ أجرا معلوما. [۳۶]

نبی علیہ الصلوٰۃ السلام ایک کھیت میں تشریف لے گئے۔ اس میں فصل لہرا رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: یہ کس کا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اسے فلاں نے بٹائی پر لے رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ اس کھیت کو اسے بغیر کسی معین بٹائی کے عطا کر دیتا تو زیادہ اچھا تھا۔

ایک اور حدیث ہے:

من كانت له أرض فليزرعها أو يمنحها أخاه ولا يؤجرها إياه. [۳۷]

اگر کسی کے پاس زمین ہے تو یا تو وہ خود اسے کاشت کرے یا اپنے بھائی کو عطا کر دے۔ اسے اپنے بھائی کو نہ بٹائی پر نہ دے۔

زمین کو اس طرح بٹائی پر دینے کے سلسلے میں اسلام کا یہ جو نقطہ نظر ہے۔ اس پر اقتصادی لحاظ سے پوری طرح غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سے اس امر کی صراحت ہوتی یہ کہ اسلام عمل و محنت اور سرمائے کی شراکت کس اصول پر چاہتا ہے اور وہ کون سے حالات ہیں جن میں یہ شراکت مباح ہے اور کن حالات میں اس کا حکم کراہت کا ہے۔

مساوات:

جب بھی انسانیت کی پشت پر ظلم وطغیان کے کوڑے برسے، اس نے ہمیشہ مساوات کے خواب دیکھے۔ صدیاں گزر گئیں اور اقوام عالم مساوات کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور انہیں یہ مساوات سوائے فلسفیوں کی تصنیفات کے اور کہیں نظر نہ آئی۔ گویا مساوات ایک سراب ہے۔ جب بھی اس کے پاس پہنچو، وہ نظروں سے روپوش ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوتے ہیں۔ آپ اس خواب کو ایک حقیقت بنا دیتے ہیں۔ ایسی حقیقت جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا اور پہلی دفعہ دنیا میں ایک

۳۶- صحیح البخاری، کتاب الھبة، حدیث ۲۶۳۴، ج ۳، ص ۲۱۸ ج ۴

۳۷- صحیح ابن حبان، کتاب الاجارۃ، حدیث نمبر ۵۱۴۸، ج ۱۱، ص ۵۴۹

معاشرہ معرض وجود میں آیا۔ جو مساوات کے بارے میں باتیں کرنے کے بجائے اس پر عامل تھا۔ اگرچہ بعد میں اسلامی افق سے یہ درخشاں نور چھپ گیا لیکن وقتاً فوقتاً اسلامی تاریخ میں اس کی تھوڑی بہت شعاعیں نظر آتی رہیں۔ اب یہ قصور اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا ہے۔ جنہوں نے اپنے اسلام کو ضائع کر دیا اور ان کے ہاتھ سے عزت و احترام کے اسباب جاتے رہے۔ اس ضمن میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ ایک ایسا دین ہے، جو ہمیشہ کے لیے ہے، اور ایک ایسا سرچشمہ ہے، جو کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس کی طرف لوٹیں گے تو اس کو اسی حالت میں پائیں گے جس کہ رسول اللہ ﷺ چھوڑ گئے تھے۔ یعنی ہماری روحوں کے لیے غذا ہے۔ ہماری قوت کا سرچشمہ ہے اور عدل و انصاف کی حقیقی اساس ہے۔ اس میں ظلم بار نہیں پا سکتا۔ اس میں ایسی مساوات ہے کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور اگر ایک انسان کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر۔ اسلام میں مساوات صرف تنگ مادی دائرے تک محدود نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے نفوس کو ہر قسم کی عبودیت و غلامی سے آزادی دیتا ہے۔ اس مساوات کا نقطہ آغاز ایک خدا پر ایمان لانا ہے، جو سب کا پروردگار ہے اور وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے۔ وہی مارتا ہے اسی کے ہاتھ میں روزی ہے اور ہر چیز پر اسی کا اقتدار ہے، ہمارے اور اس کے درمیان کوئی اور واسطہ نہیں اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہے، ہم سب اسی کے بندے ہیں، خواہ ہم میں سے کوئی کتنا بھی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو۔

جب مسلمان اسلام کے اس عقیدے میں جو اساسی معانی مضمر ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں۔ تو ان میں سے ہر ایک اپنے کمزور اور فانی وجود کو خدائے قادر و رحیم کی قدرت سے براہ راست مربوط محسوس کرتا ہے اور اس سے اس کے اندر بہادری اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو اسے یہ شعور بخشتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں معاشرے کے ہر ہر فرد کے مساوی ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے چنانچہ جب مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر جاتا ہے تو پھر اسلامی معاشرہ اس مرحلے میں داخل ہوتا ہے جو حقیقی مساوات کا ہے۔ اس کے بعد ہی تشریعات اسلامی بروئے کار آتی ہیں اور یہ اسلامی معاشرہ وہ امت بنتا ہے، جسے قرآن مجید نے "خیر امۃٍ اخرجت للناس" کہا ہے۔

مساوات اسلام کا ایک امتیازی نشان ہے اور غیر مسلم انصاف پسند مصنّفین تک نے اسلام کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور برطانوی مفکر تھامس کارلائل نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اس مساوات پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (۳۸)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے)۔

﴿وَ مَآ اَمْوَالُکُمْ وَ لَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ ھُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ﴾ (۳۹)

(اور تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے۔ مگر ہاں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔ سو ایسے لوگوں کے لیے ان کے عمل کا دگنا صلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں چین سے ہوں گے)۔

غرض یہ اسلام تھا، جس نے مسلمانوں کو بھائی بھائی بنایا۔ ان کے دلوں کو متحد کیا۔ انہیں قانون کے سامنے اور معاشرے کے اندر مساوات دی۔ اور اس امر کی وضاحت کی کہ انسان کا عمل ہی اس کی شفا کر سکتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ اور یہ کہ ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (انسان کے لیے وہی ہے، جس کی اس نے کوشش کی...... ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا)۔

غلامی اور مرد وعورت میں مساوات:

بعض لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے غلامی کو روا رکھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو روا نہیں رکھا۔ بلکہ جب وہ آیا تو اس نے دیکھا کہ غلامی جزیرہ عرب کے معاشرے کی اساس ہے، چنانچہ اسلام نے ایسے قواعد وضع کئے، جن سے اس کا قلع قمع ہو سکے۔ اسلام غلامی کا دروازہ بالکل تو بند

۳۸- سورہ الحجرات: ۱۳

۳۹- سورہ سبا: ۳۶-۳۷

نہ کر سکا، لیکن اس نے نئے غلام بنانے کا دروازہ کافی تنگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نے غلاموں کا درجہ بلند کیا اور انہیں اللہ کی نظر میں اور بہت سے اجتماعی حقوق میں آقاؤں کے برابر کر دیا۔ اسلام نے مال کے عوض غلاموں کو آزاد کرنے (مکاتبت) کا حکم دیا اور بیت المال میں سے ایک رقم غلاموں کو آزاد کرانے (**فک الرقاب**) کے لیے خرچ کرنا فرض ٹھہرایا۔ اس طرح اسلام نے بہت سی غلطیوں اور گناہوں کا کفارہ غلاموں کو آزاد کرنا قرار دیا۔ اگر اسلامی معاشرہ اس راہ پر چلنے سے انحراف نہ کرتا، جو شریعت اسلامی نے غلاموں کے بارے میں تجویز کی تھی، تو ان ذرائع سے جو اللہ کی طرف سے فرض کیے گئے تھے، غلامی کبھی کی مٹ گئی ہوتی۔ مزید برآں اسلام نے غلاموں اور موالی کو حکومت کے اعلیٰ عہدے دیے اور ان میں سے بڑے بڑے امراء، علماء اور قاضی ہوئے اور اگر یہ روایت صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر ابو حذیفہ کے غلام سالم زندہ ہوتے، میں اپنے بعد انہیں خلیفہ بناتا۔ تو اس صورت میں حضرت عمر کے بعد خلافت کی مسند پر ایک غلام فائز ہوتا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بہت سی روایات ایسی ہیں، جن میں غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابوہریرہؓ اس آرزو کا اظہار کیا کرتے تھے کہ جب میں مروں، تو غلام ہوں۔

جہاں تک مرد اور عورت کی مساوات کا تعلق ہے، اسلام سے پہلے کسی نظام نے مرد اور عورت کو اللہ کی نظروں میں مساوی قرار نہیں دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا﴾ (۴۰)

(اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (۴۱)

(جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب

۴۰- سورہ النساء: ۱۲۴

۴۱- سورہ النحل: ۹۷

ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں کو اجر دیں گے)۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ﴾ (۴۲)

(سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت اکارت نہیں کرتا)۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں کو اہلیت اور اپنے امور کا انتظام کرنے کے حقوق میں مساوی قرار دیا ہے اور اکثر نظاموں میں اب تک یہ نہیں ہے۔ شادی شدہ عورت ابھی تک وہاں ان حقوق سے محروم ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (۴۳)

(مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے)

اسلام نے بعض محدود و معین حالات کے علاوہ مردوں کو ہرگز عورتوں پر فضیلت نہیں دی اور اس کی وجہ بھی ہر دو کی الگ الگ فطری استعداد اور ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ جب مرد اور عورت اپنی اپنی فطری استعدادوں اور ذمہ داریوں میں برابر ہوں، تو ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا اور ان کا مساوی ہونا فرض ہو گا۔ اب جو اسلام نے لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کو وراثت میں دگنا حصہ دیا ہے۔ تو اس کے ساتھ مرد پر عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری بھی ڈال دی ہے اور یہ ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی گئی۔

اسلام نے عورتوں کو چودہ سو سال پہلے جو حقوق دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جا کر کہیں برطانیہ اور فرانس جیسی حکومتوں نے وہ حقوق عورتوں کو دیے ہیں۔ بعض مسلم معاشروں میں عورتوں کو دبانے اور ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں لگانے کے لیے جو چیخ پکار ہوتی ہے تو اس کا سبب ان مخصوص معاشروں کی اپنی روایات و تقالید ہیں، اس کا احکام اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۴۲- سورہ آل عمران: ۱۹۵

۴۳- سورہ النساء: ۳۲

کفالت اجتماعی:

اسلام ہی وہ مذہب ہے، جس نے سب سے پہلے کفالت اجتماعی کی دعوت دی اور اسے معاشرے کے لیے ضروری قرار دیا۔ اسلام نے حکومت پر فرض کیا کہ وہ اپنی سیاسی طاقت کے بل پر کفالت اجتماعی کو عمل جامہ پہنائے اور اپنے بیت المال سے اس کو مالی مدد دے لیکن افسوس اسلام نے دنیا میں پہلی بار جس خواب کو حقیقت کر دکھایا، جیسے کہ قرآن مجید ارشاد ہوا:

﴿وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾

(ہم ان لوگوں پر جو زمین میں کمزور تھے، احسان کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو امام اور اس زمین کا وارث بنائیں)

وہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور اسلام کے بہت سے احکام بے اثر ہو کر رہ گئے۔ انہی میں سے کفالت اجتماعی کا اسلامی نظام بھی تھا۔ اب اس زمانے میں بہت سی متمدن حکومتیں کفالت اجتماعی کی داعی ہیں اور یہ چیز اس دور کا خصوصی شعار ہو گئی ہے۔

کفالت اجتماعی کے سلسلے میں اسلام نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اس نے کام کرنے کو شرعاً واجب اور بے کاری کو حرام قرار دیا بلکہ اس کے نزدیک محتاج اور معذور کے علاوہ دوسرے کے لیے بھیک مانگنا جرم ہے۔ ہر فرد کے لیے کام کرنے کو واجب قرار دینے کے بعد اسلام کفالت اجتماعی کے ضمن میں دو عملی تدابیر پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ خاندان پر فرد کی معاشی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور دوسرے اسلام نے صدقہ و احسان کرنے پر زور دیا ہے، اس کے بعد حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بیت المال سے محتاجوں کی مدد کرے۔

کفالت اجتماعی کا اصول رسول اللہ ﷺ ہی کے عہد میں معین ہو گیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی بیوہ رسول اکرم علیہ الصلاۃ و السلام کے پاس آئیں تا کہ آپ ﷺ سے اپنے یتیم بچوں کے لیے کچھ کہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم ان بچوں کے معاملے میں فقر و احتیاج سے خائف ہو۔ میں اس دنیا میں اور آخرت میں ان کا ولی اور ذمہ دار ہوں۔ آپ ﷺ نے حضرت جعفرؓ کی بیوی سے یہ بات اس بنا پر نہیں کہی کہ حضرت جعفر آپ کے قریبی عزیز تھے، مگر آپ نے یہ بحیثیت امام اور حاکم

یہ فرمایا تھا۔

آنحضرتﷺ کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس اصول کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ ان دونوں خلفا نے کفالت اجتماعی کے ضمن میں جو کچھ کیا، اس کی مثالیں تاریخ اسلام میں بکثرت موجود ہیں۔

کفالت اجتماعی کے قوانین کو مندرجہ ذیل تین خطرات سے جو بالعموم افراد معاشرہ کو پیش آتے ہیں، عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔

۱- جسمانی خطرات جو افراد کو لاحق ہوتے ہیں اور انہیں کام کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتے جیسے کہ بیماریاں، جسمانی معذوری اور بڑھاپا۔

۲- پیشہ وارانہ خطرات، وہ خطرات جو کام کرنے والوں کو اپنے کام کے سلسلے میں پیش آتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ جزوی یا کلی طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

۳- غریبی و افلاس کے خطرات، ایک شخص کثیر العیال ہے اور اس کی آمدنی کم ہے۔

ان خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسلام کیا تجویز کرتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں غور و توجہ سے حضرت علیؓ کا وہ خط پڑھنا چاہئے، جو انہوں نے اپنے مصر کے والی کو لکھا تھا۔ [۴۴] حضرت علیؓ نے لکھا:

> نچلے طبقے کا جس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں، مسکینوں، محتاجوں، مصیبت زدوں اور جسمانی معذوروں کا خیال رکھو۔ ان طبقوں میں سے بعض تو سوال کر لیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جنہیں بغیر سوال کے دینا چاہئے۔ ان کے معاملے میں اللہ نے اپنے جس حق کا تمہیں ذمہ داری بنایا ہے اسے دور کرنے میں اللہ کو حاضر و ناظر جانو۔ اس کے لیے ایک تو اپنے بیت المال کا دوسرے مال غنیمت کا حصہ مقرر کر دو۔ اسلام کا عمل دخل پوری مملکت اسلامیہ میں ہے، جو مذکورہ بالا طبقوں میں سے دور دراز حصوں میں رہتے ہیں، ان کے بھی اتنے ہی حقوق ہیں، جتنے قریب کے حصوں میں رہنے والوں کے۔ ان میں سے ہر ایک کے حق کو تمہیں ملحوظ رکھنا

۴۴- نہج البلاغۃ، ج ۲، ص ۱۰۰

چاہئے۔ تمہاری اپنی آسودہ حالی اور حال مستی ان سے تمہیں غافل نہ کردے۔ اس بارے میں تمہاری ذرا سی کوتاہی بھی قابل معافی نہیں ہوگی۔ خواہ تم ایک اہم اور بڑے کام کو اچھی طرح بھی کر لو۔ اس کے باوجود تمہاری توجہ ان لوگوں سے نہیں ہٹنی چاہیے اور نہ تم ان سے تکبر سے پیش آؤ۔ ان میں سے جو شخص تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ نگاہوں میں نہیں جچتا اور لوگ اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ اس کا خاص خیال رکھو۔ جو فرماں بردار اور تواضع کرنے والے ہیں، ان پر تمہیں اعتماد کرنا چاہیے...... یتیم کنبوں اور چھوٹی عمر والوں کی، جن کے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ وہ خود سوال کر سکتے ہیں، ان کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کرو۔ بے شک والیوں پر یہ ذمہ داریاں بڑی گراں ہیں، لیکن حق ہوتا ہی بڑا گراں ہے۔''

حضرت علیؓ کا اپنے والی مصر کے نام یہ خط محض باتیں نہیں، جو صفحہ قرطاس پر لکھ دی گئیں، بلکہ وہ نافذ ہونے والا قانون ہے۔ جو ایک صاحب اقتدار حاکم اپنے ایک والی کے نام بطور حکم کے جاری کرتا ہے تاکہ اسے بروئے کار لایا جائے اور اس کی مدد سے کفالت اجتماعی کے ایک بہترین نظام کی طرح پڑے۔

اس اصول کی عملی تطبیق اور معاشرتی عدل و انصاف کے قیام، نیز افراد معاشرہ کو فقر و احتیاج سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں تاریخ اسلام میں جو مشکلات پیش آتی رہی ہیں۔ اب میں ان سے بحث کروں گا۔

فقر و احتیاج:

اس بارے میں اس واقعہ کا ذکر کرنا کافی ہے، جو حضرت عمرؓ کو ایک عورت کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ عورت زبردستی اپنے بچے کا دودھ چھڑا رہی تھی اور بچہ تھا کہ بری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے جواب دیا (اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ حضرت عمرؓ سے مخاطب ہے) کہ عمرؓ دودھ پیتے بچے کو تو وظیفہ نہیں دیتے۔ میں اس لیے بچے کا دودھ چھڑا رہی ہوں کہ مجھے اس بچے کا وظیفہ ملے اور اس سے میں اپنی احتیاج پوری کروں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ اپنے گھر لوٹے۔ انہوں نے نماز فجر ادا کی، اور سلام پھیرنے کے بعد اپنے آپ سے کہنے لگے۔ اے عمر! تیرے لیے خرابی ہو۔ معلوم نہیں تیرے اس حکم سے مسلمانوں کے کتنے بچے مرے ہیں پھر انہوں نے منادی کرنے والے سے

یہ منادی کرائی۔ اے لوگو! اپنے بچوں کو جلد دودھ نہ چھڑاؤ ہم نے ہر بچے کے لیے اس کے پیدا ہونے کے بعد سے ہی وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

ایک عورت کا واقعہ جو اپنے بھوکے بچوں کو چولہے پر ہنڈیا رکھے جس میں کہ خالی پانی اور صرف کنکریاں تھیں، بہلا رہی تھی کہ حضرت عمر وہاں پہنچے، تاریخ اسلام میں مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ خود بیت المال سے اس کے لیے غلہ لے کر گئے۔ خود بچوں کے لیے کھانا پکایا اور جب تک وہ کھا کر سیر نہیں ہوئے۔ وہ وہاں رہے۔

بڑھاپا اور بیماری:

حضرت علیؓ نے والی مصر کے نام جو ہدایات بھیجی تھیں، ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہاں ہم حضرت عمرؓ کی زندگی کی بعض اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک اندھے کو دیکھا کہ وہ راہ چلنے والوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کس چیز نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے، اس نے کہا۔ جزیہ، احتیاج اور بڑھاپے نے، حضرت عمرؓ اسے اپنے گھر لے گئے اور اس کی ضرورت پوری کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور اس سے کہا ''یہ کتنی بری بات ہے۔ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہم نے اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے ذلیل کر رہے ہیں۔ بے شک صداقات فقرا اور مساکین کے لیے ہیں۔ ''**انما الصدقات للفقراء و المساکین**'' اور یہ شخص مساکین اہل کتاب میں ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں سے جزیہ معاف کر دیا تھا اور ان کے گزارے کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر کیے تھے۔ غرض اس بارے میں حضرت عمر نے ایک شان دار اصول وضع کیا۔ جس کی رو سے عدل اجتماعی کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہ رکھا گیا۔ بلکہ اس میں تمام مسلم اہل وطن شامل تھے۔ اس کی ایک اور مثال حضرت عمر کا وہ واقعہ ہے کہ آپ شام جاتے ہوئے ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے، جنہیں کوڑھ تھا اور وہ عیسائی تھے، حضرت عمرؓ نے انہیں صدقات دینے کا حکم دیا اور ان کا گزارہ مقرر کر دیا۔

ایک دفعہ حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کو رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ چپکے سے ان کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت عمرؓ ایک مکان میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے نکلے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت طلحہؓ اس مکان میں گئے اور وہاں ایک اندھی معذور بڑھیا دیکھی۔ حضرت طلحہؓ نے اس سے پوچھا کہ یہ

کون شخص تمہارے پاس آتا ہے۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ ایک عرصہ سے میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جس چیز کی مجھے ضرورت ہوتی ہے وہ لا کر دیتا ہے اور میری جو تکلیف ہوتی ہے، وہ دور کرتا ہے۔

ماؤں کی دیکھ بھال:

ماؤں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ حضرت عمرؓ اپنی عادت کے مطابق ایک رات گھر سے نکلے۔ پھرتے پھراتے وہ ایک جگہ پہنچے تو وہاں ایک عورت کو درد زہ میں کراہتے سنا۔ تو واپس گھر آئے اور اپنی بیوی ام کلثوم کو اس عورت کے پاس لے گئے انہوں نے اس عورت کی ولادت میں ضروری مدد کی۔ اس دوران میں حضرت عمرؓ خود کھانا تیار کرنے میں لگ گئے۔

یہ اور اس کی طرح دوسری اعلیٰ انسانیت کی مثالیں جو ہماری تاریخ میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام میں اجتماعی خطرات کا کس طرح مقابلہ کیا جاتا تھا۔ اگر مسلمان اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں ان اصولوں پر عامل رہتے تو آج ہماری بالکل دوسری حالت ہوتی لیکن ہم سے لغزشیں ہوئیں، جس کے نتیجے میں ہم کمزور پڑ گئے۔ ہم پھر اسی صورت میں اپنی عزت بحال کر سکتے ہیں اگر ہم اللہ کے حکمران کی طرف لوٹیں اور ان ارشادات پر عمل کریں۔

کفالت اجتماعی کے مالی ذرائع:

کفالت اجتماعی کے لیے مالی آمدنی کا سب سے پہلا ذریعہ تو زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر فرض ہے اور یہ اسلام کے ارکان میں تیسرا رکن ہے۔ زکوٰۃ ہی کے لیے حضرت ابوبکر نے مرتدین سے جنگ کی تھی۔ زکوٰۃ کہاں خرچ ہو، قرآن مجید نے ان مصارف کی یوں وضاحت کی ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ﴾[۴۵]

(صدقات تو صرف حق ہے غریبوں اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان پر متعین ہیں اور جن کی دل جوئی کرنا ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں

۴۵- سورہ التوبہ:۵۹

کے قرضہ میں اور جہاد میں اور مسافروں میں)

یہ ایک امر مسلم ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مصارف اب ختم ہو گئے ہیں۔ جہاں تک "**مؤلفة قلوبهم**" کا تعلق ہے، حضرت عمرؓ کے عہد خلافت سے انہیں زکوٰۃ میں سے حصہ نہیں دیا جارہا۔ "**فی الرقاب**" یعنی غلاموں کا قصہ اب پرانا ہوگیا ہے۔ اس کی حیثیت محض تاریخی رہ گئی ہے اور غلام سرے سے رہے ہی نہیں۔ رہے "**العاملین علیها**" یعنی زکوٰۃ کی تحصیل کا کام کرنے والے تو وہ اب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور سرکاری خزانے سے ان کو تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے ان پر زکوٰۃ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے اب زکوٰۃ کی ساری رقم بیت المال میں جائے گی تا کہ اس سے کفالت اجتماعی کی ضرورتیں پوری ہوں۔

عطیات وصدقات:

زکوٰۃ کے علاوہ کفالت اجتماعی کی آمدنی کی ایک اور مد عطیات وصدقات ہیں، حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں یہ مسئلہ وجہ نزاع بن گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک مجلس میں جہاں کعب الاحبار موجود تھے، یہ بحث چھڑی کہ اگر مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو کیا اس کے بعد مال میں کوئی اور حق رہتا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کے متعلق کعب سے پوچھا تو انہوں نے کہا نہیں۔ اس پر حضرت ابو ذرؓ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ﴾ (۴۶)

(یہ نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کو۔ لیکن نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتب سماویہ پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو، اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو محتاجوں کو اور مسافروں کو سوال کرنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا

۴۶- سورہ البقرہ:۱۷۷

ہو)۔

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زکوٰۃ کی ادائیگی اور ذوی القربیٰ اور یتامی پر خرچ کرنے میں تفریق کی ہے۔ یہ رائے حضرت ابو ذرؓ کی اپنی ہے کیونکہ **ایتاء الزکاۃ** کے عطف کا پہلی عبارت پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر، بہرحال جہاں تک مال خرچ کرنے کا تعلق ہے، قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں اس پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں اس کا حکم ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ یہاں تک کہ غریب بیوہ عورت اور مسکین کی مدد کرنے والے کا وہی درجہ ہے۔ جو اللہ کی راہ جہاد کرنے والے کا ہے۔ اسی طرح جو شخص ایک یتیم کو اکل و شرب میں اس وقت تک اپنے ساتھ رکھے، جب تک وہ اس سے بے نیاز نہ ہو جائے اس کے لیے جنت یقینی ہے۔

توظیف اموال:

امام ضرورت کے وقت لوگوں سے مال لینے کا حق رکھتا ہے، اسے ''توظیف'' کہتے ہیں لیکن امام صرف ضرورت کے وقت ہی اس مد کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ تمام حالات میں اس پر عمل نہیں ہوگا۔ فقہ مالکی میں مصالح مرسلہ کے نظریے کے تحت جب بیت المال خالی ہو۔ فوج کی ضرورتیں بڑھ جائیں اور وہ بیت المال سے پوری نہ کی جا سکی ہوں، تو اس صورت میں امام اغنیاء پر اس وقت تک اتنا ٹیکس لگا سکتا ہے کہ جب تک بیت المال میں مال نہ آ جائے۔ اس سے ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ امام کو چاہئے کہ وہ یہ زائد ٹیکس فصلوں کی کٹائی یا پھلوں کو توڑنے کے وقت لگائے۔

اس بارے میں یہ رائے صحیح نہیں کہ امام ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قرض لیے۔ امام شاطبی نے جواب یہ دیا ہے کہ غیر معمولی حالات میں صرف اس صورت میں قرض لیا جا سکتا ہے کہ بیت المال میں کہیں سے آمدنی کی توقع ہو اور اس کا انتظار کیا جا رہا ہو لیکن اگر کسی آمدنی کا انتظار نہیں اور بیت المال کے ذرائع آمدنی اتنے کم ہیں کہ وہ ضرورت کے لیے کافی نہیں تو امام کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ لوگوں پر مزید ٹیکس لگائے۔

غرض امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصالح مرسلہ کی بنیاد پر، جس پر کہ مالکی فقہا کا عمل ہے۔ کفالت اجتماعی کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنے کی خاطر بیت المال کی آمدنی کی اس تیسری مد سے کام لے۔ جب اس کی دو سابق الذکر مدوں یعنی زکوٰۃ اور عطیات و صدقات سے معاشرے کی ضرورتیں پوری نہ

ہوسکیں۔

اختتامیہ:

وقت کی تنگی اور اپنی معلومات کی کمی کے باوجود میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے، اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اجتماعی ظلم کے سد باب کے لیے اسلام کس قدر کوشاں ہے۔ نیز اسلام ہی میں ہیں وہ روشنی نظر آتی ہے، جو بری نیتوں اور نفوس انسانی کی حرصوں کو آشکار کرتی ہے اور ایک متوازن معاشرہ کے قیام کی راہ دکھاتی ہے، جس کے لیے اور عدل دو لازم وملزوم جزو ہیں۔

یہاں یہ بحث جو میں نے کی ہے، یہ ابتدائی نوعیت کی ہے اور اس کے نقائص اور اس کی بعض کوتاہیوں کا بھی مجھے اعتراف ہے۔ اب میں اپنی اس بحث سے بعض بنیادی اصول اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس امید پر کہ ان پر مزید غور وخوض ہوگا اور ان کے بارے میں آپس میں گفت وشنید ہوگی اور اس طرح ان میں سے جن باتوں پر آپ اتفاق کریں گے۔ انہیں قبول کر لیا جائے گا۔ پھر ان بنیادی اصولوں کو زیادہ تفصیل سے قلم بند کر کے ایسی شکل دے دی جائے گی کہ آج اس جدید دور میں ہمارے لیے جو سب سے اہم مشکل ہے اسے حل کرنے کے لیے اللہ کا جو حکم ہے۔ وہ واضح ہو جائے۔

یہ بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

۱- شریعت اسلامی کی حدود کے اندر ملکیت انفرادی حقوق قابل حفاظت بھی ہیں اور قابل احترام بھی۔

تمام اموال اللہ کی ملکیت کے حکم میں آتے ہیں اور اللہ نے اپنے بندوں کو ان پر اپنا نائب مقرر کیا ہے تاکہ وہ انہیں اس طرح خرچ کریں اور اپنے مفادات و مصالح کے مطابق ان میں یوں تصرف کریں کہ اس سے جماعت کے مفادات و مصالح پر زد نہ پڑے۔ کیوں کہ دراصل یہ جماعت ہی کے مفادات و مصالح ہیں، جن کے لیے اللہ نے اموال پیدا کیے۔

ملکیت ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اسلام نے اسے غضب، چوری اور ضبطی سے پوری طرح محفوظ و مامون کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام نے صاحب ملکیت پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کے استعمال میں ظلم و زیادتی کا ارتکاب نہ کرے اور اس مقصد سے منحرف نہ ہو، جس کے لیے وہ ملکیت اسے سپرد کی گئی ہے۔

۲- اسلام فرد کے وجود کا احترام کرتا ہے اور وہ ان حدود کے اندر جن سے جماعت کے مفادات پر زد نہ

پڑے اور اس شکل میں جس سے کہ جماعت کے مفادات عملاً پورے ہوئے ہوں، فرد کی آزاد اور اس کے احترام کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔

معاشرہ کے افراد کے درمیان مساوات کا قیام اسلام کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ جو یہ فرض کرتا ہے کہ تمام اہل وطن کو مساوی مواقع حاصل ہوں اور انہیں نظام حکومت میں برابر کے درجے ہوں۔ اسلام نسلی تفرقے کو اس کی ہر شکل میں ناپسند کرتا ہے، نیز وہ ہر فرد کو حق دیتا ہے کہ اسے کام ملے اور یہ کہ اس سے کام کیا جائے۔

۳- اسلامی معاشرے کے ہر فرد کا یہ ثابت شدہ حق ہے کہ مرض، جسمانی معذوری، غریبی اور بڑھاپے میں اس کی کفالت ہو، اس طرح ان تمام حالات میں فرد کی کفالت کی جائے۔ جب وہ وسائل معاش سے ایسے اسباب کی وجہ سے محروم ہو جائے، جن میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہ ہو۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں جو کچھ میں نے کہا ہے اسے وہ قبول کرے اس کا مجھے اجر خیر عطا فرمائے اور آپ سب حضرات کو اللہ اپنے دین کی خدمت اور اپنے احکام کی سر بلندی کی توفیق دے اور ہمارے ارباب حکومت میں سے مومنوں کو اپنی شریعت کے قیام میں مدد دے اور ان کا ساز گار ہو اور اللہ ہی ہے توفیق دینے والا اور سیدھے راستے پر چلانے والا۔

❁❁❁❁❁